ماسٹر صاحب

فہرست مضامین

نام دیو مالی

مولوی عبدالحق

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔

اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے میں مگن رہتا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا۔ ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ

پیدا ہو جاتا تو اسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ، غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کر لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھونڈ کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا! یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آب حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کو تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے' ٹوکیو سے جاپانی' طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فن باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی' کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے' وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ، بھولا بھالا اور منکسرالمزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہتا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا، وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا، لیکن اسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ

پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

پطرس بخاری

گیڈر کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ جی سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔" وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں، "اچھا! . . . اچھا! . . . جاگ گیا ہوں . . ." آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے! یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں 'قم' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ بھلا ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ آخر کار جب لیمپ جلایا، تو طوفان تھما۔

اب جو ہم آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے جگمگا رہے ہیں! پڑوسی کو آواز دی ''لالہ جی! . . . آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟'' کہنے لگے ''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟'' چونک کر پوچھا ''کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟'' کہنے لگے ''کچھ ساڑھے سات منٹ اوپر تین ہیں۔'' میں نے کہا ''ارے' خدائی فوجدار! بدتمیز کہیں کے! میں نے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا' یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ لاحول ولا قوۃ!'' لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے سو گئے۔ پھر حسب معمول دس بجے اٹھے اور سیر کو نکل گئے۔

شام کو ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی ''مسٹر میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔'' دل نے کہا ''دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔'' ہم بھی میز کے سامنے آ بیٹھے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ سامنے کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔

سوتے سوتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں۔ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ تتلا کے درخواست کی ''لالہ جی' صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی' میں آپ کا بہت ممنون

تصویر: فیکا

ہوں، کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں . . .'' کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔
''سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔'' توبہ! خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے گولہ باری بند کر دی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر کا نہیں پتہ۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں، لیکن دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ پوچھنے لگے ''تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟'' میں نے کہا ''ہاں ہاں' واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! بے شک۔'' شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ ہم نے اپنی ہمت کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا کہ ''دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے . . '' خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا سی اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ (لحاف کانوں پر سرک آیا) . . . تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں . . . کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے . . . کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے . . . (لحاف سر پر، آنکھیں بند) . . . تو اب چھ بجے ہیں۔ گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں، شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا . . . نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا . . . شیکسپیئر . . . ورڈزورتھ . . . دیوانگی . . . سبزہ زار . . . بادبہاری . . . کشمیر . . . میں آفت کا پرکالہ ہوں . . .'' پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا تو وہی دس بج رہے تھے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ کہنے لگے ''مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی، آپ نے جواب نہ دیا؟'' میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا ''اوہو۔ لالہ جی میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔'' بولے ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ بولے ہی نہیں۔'' ہم نے نہایت تعجب کی نظر سے ان کو دیکھا گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر مسکرا کے کہا ''ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اس وقت . . . اے . . . نماز پڑھ رہا تھا!'' لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے اور ہم سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

ہم اور خانے

یوسف ناظم

کبھی تم نے غور کیا کہ ہم سب کتنے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ غور کرنے کی تمہیں فرصت ہی کہاں ملی ہوگی۔ اتنا ڈھیر سارا تو ہوم ورک ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا بہت گھر کا کام' تھوڑا بہت کھیل' لیکن اب ہمارے ساتھ غور کرلو۔

ہم جن خانوں میں بٹے ہوئے ہیں انہیں گنتے جاؤ تو بس گنتے ہی رہو۔ ہم نے بھی انہیں گننے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی تھک گئے۔ کچھ خانے جو بہت ضروری اور بہت مشہور ہیں ہمیں یاد رہ گئے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ خانوں سے واسطہ نہ پڑے۔

آدمی کو سب سے پہلے ایک غریب خانہ چاہئے۔ سر چھپانے کی جگہ چھوٹی ہو یا بڑی' اچھی ہو یا بری' عالی شان ہو یا بے شان' غریب خانہ ہی کہلاتی ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے گھر کسی کو کھانا کھلانے بلاتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ آج رات آپ کھانا غریب خانے پر کھایئے گا۔ جواب میں اس شخص کو کہنا چاہئے کہ جی بہت اچھا میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاؤں گا۔ پریشان مت ہو کہ ایک ہی گھر کے دو نام کیسے ہوئے' یہی تو خوبی ہے اردو زبان کی

غریب خانہ بن جائے تو آدمی اس میں سب سے پہلے باورچی خانہ بناتا ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے باورچی خانہ میں آگ سلگانا ضروری ہوتا ہے۔ گھر کا باورچی خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کے وقت باورچی خانے میں ان برتنوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے جو دن بھر کے استعمال کے بعد دھوئے بغیر یونہی چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ رات میں بھلا کون برتن دھوتا ہے؟ برتن دھوئیں گے تو ٹی وی پر ڈرامہ کب دیکھیں گے۔ باورچی خانے میں اگر ہر چیز پھیلی ہوئی نہ ہو تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ باورچی خانے اور دیوان خانے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔

اس باورچی خانے میں ایک نعمت خانہ ہوتا ہے۔ نعمت خانہ اس چھوٹی سی الماری کو کہتے ہیں جو اب گھروں میں نہیں پائی جاتی۔ جب یہ الماری ہوا کرتی تھی اس میں دودھ، دہی اور کبھی کبھی کوئی مٹھائی سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ بچے اسی نعمت خانے سے مٹھائی چرا کر کھاتے تھے۔ اپنے ہی گھر میں چرائی ہوئی مٹھائی کیوں اتنی لذیذ ہوتی تھی کوئی نہیں بتا سکتا۔ آج جو لوگ والدین ہیں انہوں نے بھی یہ کام ضرور کیا ہو گا۔ اسی لئے تو یہ الماری نعمت خانہ کہلاتی تھی۔ اب اس کی جگہ فرج رکھے جانے لگے ہیں۔ جن گھروں میں بچوں کو چرا کر کوئی چیز کھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی وہ بھی باہر جا کر چوری چھپے کھٹی میٹھی چیزیں کھاتے ہی ہیں۔ نعمت کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو آسانی سے نہ ملے۔

گھر بڑا ہو تو اس میں ایک دیوان خانہ بھی ہوتا ہے۔ بچوں کو دیوان خانے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ بعض گھروں میں تو بچوں کی ماں کا بھی دیوان خانے میں آنا اور کسی چیز کو ہاتھ لگانا منع ہوتا ہے۔ پھر بھی مائیں دیوان خانے میں پہنچ کر صاحب خانہ کا قلم اٹھا لیتی ہیں اور اس کی مدد سے پاجامے میں ازاربند ڈال کر قلم ایسی جگہ رکھ دیتی ہیں کہ سارا گھر بھی ڈھونڈے تو یہ نہ ملے۔ دیوان خانے میں طرح طرح کے ملاقاتی آتے ہیں۔ آج کل دیوان خانے کو ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔

اب ذرا گھر کے باہر چلو۔ یہ ڈاک خانہ ہے۔ اس کے بغیر بھی بھلا کوئی رہ سکتا ہے؟ کبھی تم نے سوچا کہ ڈاک خانوں میں یا سڑکوں پر جو لیٹر بکس ہوتے ہیں ان کا رنگ لال کیوں ہوتا ہے؟ یہ خطرے کی علامت ہے۔ خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ تم جو خط اس میں ڈالو گے وہ پہنچے گا بھی یا نہیں۔ تمہارے نام جو اچھے اچھے رسالے بھیجے جاتے ہیں ان میں سے کچھ رسالے کم کیسے ہو جاتے ہیں؟ تمہارے نام اگر امریکہ یا لندن سے کوئی خط آتا ہے تو لفافے پر جو ٹکٹ لگتے تھے وہ کہاں گئے؟ کبھی کبھی تو لوگوں کے منی آرڈر کھو جاتے ہیں، پارسل گم ہو جاتے ہیں لیکن کچھ بھی ہو ڈاک خانہ ہے ضروری چیز۔ یہ نہ ہو تو ہم ادھورے رہ جائیں، دنیا سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے۔

تصویر: شبہ خلیل حسن

چلو ذرا شفا خانے چلیں۔ شفا خانے کو لوگ عام طور پر دوا نہ خانہ کہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ امید اچھی رکھنی چاہئے اور زبان پر لفظ بھی اچھا آنا چاہئے۔ شفا خانے کے لفظ میں جو بات ہے وہ دوا خانے میں نہیں ہے۔ دوا خانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں دوا ملتی ہے۔ صرف دوا لے کر کوئی کیا کرے گا؟ شفاخانے کے لفظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مریض کو شفا حاصل ہوگی۔ دوا خانوں کو صاف ستھری حالت میں رکھنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اسی لئے وہ دوا خانے جہاں ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ بوائے یہ سمجھ کر کام کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں، صاف ستھرے ہوتے ہیں اور صفائی علاج کی پہلی شرط ہے۔ صاف ستھری جگہ دیکھ کر ہی آدمی خوش ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر اسے اچھی طرح دیکھ لے، اس سے اچھی طرح بات کرے، اسے ہمت دلائے تو اس کا آدھا مرض دور ہو جاتا ہے۔

سب سے اچھا خانہ جو ہمیں پسند ہے وہ کتب خانہ ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی ساری زندگی کتب خانے میں ہی گزار دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔ آدمی کو ہوا خوری بھی کرنی چاہئے، مناظر سے بھی لطف اندوز ہونا چاہئے۔

کتب خانے میں جگہ جگہ یہ نوٹس لگا ہوتا ہے 'شور مت کیجئے۔' ظاہر کہ کتب خانہ کتب خانہ ہوتا ہے ریلوے پلیٹ فارم نہیں ہوتا۔ کتب خانوں میں ایک مشکل ضرور ہوتی ہے کہ پورا

اخبار پڑھنے کے لئے بہت گھومنا پڑتا ہے اور اخبار میں پوری خبر ایک صفحے پر چھاپنا منع ہے۔ معلوم نہیں اس میں اخبار والوں کی کیا مصلحت ہوتی ہے۔ ایک خبر کا باقی حصہ پڑھنے کے لئے اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے پہلے پڑھا کیا تھا۔

کتب خانوں میں بہت سے لوگ پڑھتے کم ہیں لکھتے زیادہ۔ کوئی بھی کتاب لیں گے تو اس کے ہر صفحے پر اپنی رائے ضرور لکھیں گے۔ لکھنا ہی ہے تو گھر بیٹھ کر خود ایک کتاب کیوں نہیں لکھ لیتے۔ کچھ کتابوں سے تو بیچ کے صفحے بھی غائب ہوتے ہیں۔ یہ کون لے جاتا ہے؟ کتب خانے کو جو لوگ اپنے گھر کا نعمت خانہ سمجھتے ہیں انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ چرایا ہوا علم ہضم نہیں ہوتا۔ کتب خانہ تو وہ جگہ ہے جہاں اچھی اچھی کتابیں تحفے کے طور پر پہنچانی چاہئیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں جانے سے آدمی تعلیم یافتہ ہوتا ہے' لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کو اگر عالم فاضل بننا ہے تو اس کے لئے انہیں کتب خانے ہی جانا پڑے گا۔ یہاں فیس کم ہوتی ہے اور علم زیادہ ہوتا ہے۔

ان خانوں کے علاوہ اور بھی کئی خانے ہیں' اچھے بھی اور برے بھی' ہماری سمجھ میں جو آئے ان خانوں کا ذکر ہم نے کر دیا۔ باقی کی خانہ پری تم کرو۔

چچا چھکن نے دھوبن کو کپڑے دیئے

امتیاز علی تاج

چچی ایک دو بار نہیں بیسیوں مرتبہ چچا چھکن سے کہہ چکی ہیں کہ باہر تمہارا جو جی چاہے کیا کرو مگر خدا کے لئے گھر کے کسی کام میں دخل نہ دیا کرو۔ آپ بھی ہلکان ہوتے ہو' دوسروں کو بھی ہلکان کرتے ہو۔ چچا اس قدر ناشناسی سے کھج جاتے اور چڑ کر کہتے ''بھلا صاحب کان ہوئے' پھر کبھی آپ کے کام میں دخل دیا تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔'' لیکن دخل درمعقولات کا انہیں کچھ ایسا لاعلاج مرض ہے کہ جہاں کوئی موقع ملا' پھر لنگوٹ کس تیار۔

آج ہی دوپہر کو سنیئے۔ چچی کا جی اچھا نہ تھا' گلا آ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہلکی ہلکی حرارت بھی تھی۔ منہ سر لپیٹے دالان میں پڑی تھیں کہ دھوبن کپڑے لینے آ گئی۔ چچی نے کہا ''برتھن' آج تو میرا جی اچھا نہیں۔ کل یا پرسوں آ جائیو تو میلے کپڑے دے دوں گی۔'' دھوبن بولی ''بیوی جی! بریٹھا آج رات بھٹی چڑھا رہا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو آٹھویں دن میں دے جاتی نہیں تو وہی دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔''

چچی نے کہا ''اب جو ہو سو ہو' مجھ میں تو اٹھ کر کپڑے دینے کی ہمت نہیں۔''

چچا چھکن پرلے دالان میں بیٹھے میاں مٹھو کو سبق پڑھا رہے تھے، کہیں چچی کی بات سن پائی۔ انہیں ایسے موقعے اللہ دے۔ جھٹ ادھر آ پہنچے۔ بولے "کیا بات ہے؟ کپڑے دینے ہیں دھوبن کو؟ ہم دیئے دیتے ہیں۔" چچی بولیں "اے خدا کے لئے تم رہنے دینا! ہلکم ڈالو گے سارے گھر میں، پہلے ہی میرا جی اچھا نہیں ہے۔" چچا کب رکنے والے ہیں بھلا۔ بولے "واہ کوئی بات ہے! یہ ایسا کام ہی کیا ہے، ابھی نمٹائے دیتے ہیں۔"

چچی بڑبڑاتی ہوئی کروٹ لے پڑ رہیں اور چچا چلے دھوبن کو کپڑے دینے۔ نہ کسی سے یہ پوچھا کہ کس کے کپڑے کہاں پڑے ہیں، خود ہی گھر کے جالے لینے شروع کر دیئے۔ جو کپڑا نظر آیا، خود ہی آنکھوں کے سامنے تان کر پرکھا، یا نیچے پھیلا کر دیکھ لیا "کم بخت پتہ بھی تو نہیں چلتا کہ پہننے کا کپڑا ہے یا جھاڑن بن چکا ہے۔" کسی کپڑے کو چھوڑا، کسی کو بغل میں دبایا۔ کہیں جھک کر چارپائی کے نیچے جھانکا، کہیں ایڑیاں اٹھا کر الماری کے اوپر نظر ڈالی۔ معلوم ہوتا تھا آج چچا نے قسم کھا لی ہے کہ جو کام ہو گا آپ ہی کریں گے لیکن آخر کب تک؟ کپڑوں کی تلاش میں اسباب کی کوٹھری میں گئے تھے، پانچ منٹ بعد اندر سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔

لیجئے صاحب! حسب معمول سارا گھر چچا میاں کے گرد جمع ہو گیا اور آپ نے سنانے شروع کر دیئے اپنے احکام۔ "اب کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ جمع کرو میلے کپڑے۔ پر

دیکھو رہ نہ جائے کوئی۔ ایک ایک کونا دیکھ لیجیو۔دالان میں ڈھیر لگا دو سب کا۔ بندو تو ہمارے کمرے میں سے میلے کپڑے سمیٹ لا اور سننا وہ چھٹن یا بنو کا ایک کرتا بانس پر لپٹا ہوا کونے میں رکھا ہے، پرسوں کمرے کے جالے اتارے تھے ہم نے، وہ بھی کھولتا لائیو اور دیکھ . . . ایک بنیان ہمارا آتش دان میں رکھا ہے، بوٹ پونچھے تھے اس سے وہ بھی لیتا آنا۔ جا بھاگ کر جا۔ اماں تو بچوں کے کپڑے جمع کر۔ ہر کونے اور طاق کو دیکھ لیجیو۔ یہ بدمعاش کپڑے رکھنے کو نئی سے نئی جگہ نکالتے ہیں۔"

نوکر روانہ ہوئے تو بچوں کی باری آگئی۔ "کہاں گئے یہ سب کے سب؟ او چھٹن! لیجیے ملاحظہ فرمائیے آپ کی صورت! ارے یہ کیا حال بنایا ہے؟ کوئلوں میں کہاں جا گھسا تھا؟ اتار اپنے کپڑے نئے کپڑے پھر ملیں گے۔ پہلے میلے کپڑے یہاں لا کر رکھو اور یہ بنو کدھر گئی؟ میں کہتا ہوں، آخر یہ مرض کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ جہاں کام کی صورت دیکھی کھسک جانے کی ٹھہرا لی۔ چلو اندر، ایک کاغذ اور پنسل لا کر دو ہمیں۔ آخر لکھے بھی جائیں گے کپڑے یا نہیں؟ للو! تم بستروں میں سے میلی چادریں اور تکیوں کے غلاف نکال لاؤ۔"

غرض ایک پانچ منٹ میں گھر کی یہ حالت ہو گئی گویا آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے۔ کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، کوئی ادھر۔ کوئی چار پائی کے نیچے سے نکل رہا ہے، کوئی کونے جھانکتا پھر رہا

ہے۔ کسی نے لپٹے ہوئے بستر سے کشتی شروع کر رکھی ہے، کوئی کپڑے اتار تولیہ لپیٹے بھاگا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ چچا کے نعرے بھی سننے میں آ رہے ہیں۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں، سٹی گم ہے، ٹکریں لگ رہی ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے کی محنت سے سارے کپڑے دالان میں جمع ہوئے۔ نوکر اور بچے کپڑوں کے ڈھیر کے گرد دائرہ باندھے کھڑے ہیں۔ صورتیں سب کی ایسی ہیں گویا سوانگ بھر رکھا ہے۔ کسی کے منہ پر مٹی پڑی ہے، کسی کے بال مٹیالے ہو رہے ہیں، کسی کے کپڑوں پر جالے لگے ہوئے ہیں۔ چچا چارپائی پر بیٹھے ایک ایک کپڑے کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ ہر کپڑے کو انگلی کے سروں سے اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ کبھی دھوبن کو ڈانٹتے ہیں کہ خبردار جو ایک داغ بھی باقی رہا۔ کہیں بیچ میں وہ بنیان بھی ہاتھ آ گیا جس سے آپ نے بوٹ پونچھے تھے۔ خیال نہ رہا کہ یہ اپنی ہی کارروائی ہے، برس پڑے۔ ''اب دیکھو تو اس کی حالت، یہ انسانوں کا برتا ہوا معلوم ہوتا ہے؟ اللہ جانے بدتہذیب کہاں کہاں . . .'' داغ اچھی طرح دیکھنے سے چچا کو یاد آ گیا کہ یہ بنیان ان کے اپنے کمرے کے آتش دان میں سے برآمد ہوا ہو گا چنانچہ فوراً کپڑوں میں ملا دیا اور ارشاد ہوا

''چلو اب جو ہے سو ہے۔ لو اب کپڑوں کو الگ الگ کرو کہ کون سا کپڑا کس کا ہے؟''

دس ہاتھ کپڑے الگ الگ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ہر ایک کو اپنی کارگزاری دکھانے کا

خیال۔ دھوبن چیخ رہی ہے "اے میاں جانے دو! اے بھائی رہنے دو! میں ابھی آپ الگ الگ کر
دوں گی۔" مگر بچے کہاں سنتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "یہ میری قمیض ہے"، کوئی کہتا ہے "تمہاری کہاں
سے آئی یہ تو میری ہے" کسی کا کوٹ پر جھگڑا ہے، کسی کا واسکٹ پر۔ کوئی کرتے کی ایک آستین
کھینچ رہا ہے، کوئی دوسری۔ کسی کی پاجامے کے پائنچوں پر رسہ کشی ہو رہی ہے۔ کپڑے چرر چرر
پھٹ رہے ہیں۔ چچا سب کے ناموں کی فہرست بنانے میں مشغول ہیں۔ بیچ میں سر اٹھا اٹھا کر
ڈانٹتے بھی جا رہے ہیں "پھاڑ دیا نا؟ اب کے بنانے کو کہیو کوئی نیا کپڑا؟ جو ٹاٹ کے کپڑے نہ
بنا کر دیئے ہوں۔ چلے جاؤ سب یہاں سے۔ ہم اکیلے سب کام کر لیں گے۔"

بچوں اور نوکروں کا قافلہ رخصت ہوا اور دھوبن کے ساتھ مل کر فہرست بننی شروع ہوئی۔
اسے ہدایات دی گئیں کہ "دیکھ ہم پوری فہرست بنائیں گے کپڑوں کی۔ سب کے کپڑے جدا جدا
لکھوانے ہوں گے، اور ساتھ ہی بتانا ہوگا کہ اتنے کپڑے گرم ہیں، اتنے ریشمی، اتنے سوتی۔"
دھوبن بولی "یوں ہی تو ہمیشہ لکھے جاتے ہیں۔" چچا کو اپنی اس قابل قدر تجویز کی داد نہ ملی تو
آپ دھوبن سے چڑ گئے۔ "پگلی کہیں کی۔ ہر روز تو گھر میں ہلڑ مچا رہتا ہے کہ اس کی قمیض
بدل گئی، اس کا پاجامہ نہیں ملتا اور کہتی ہے کہ یوں ہی لکھے جاتے ہیں کپڑے۔ یوں کسی کو لکھنا
آتا تو یہ روز روز کی جھک جھک کیوں ہوا کرتی؟" دھوبن چپکی ہو رہی۔ کپڑے گننے شروع کر
دیئے۔ پر اب پہلے ہی کپڑے پر نئی بحث چھڑ گئی۔ دھوبن کہے کہ قمیض چھٹن میاں کی ہے۔ چچا

مصر ہیں کہ نہیں بنو کی ہے۔ دھوبن کہتی ہے ''میاں کیا پہلی بار کپڑے لے جا رہی ہوں، اتنی بھی پہچان نہیں مجھ کو؟'' چچا کہتے ہیں ''کپڑے بازار سے لاتے ہیں ہم، سلواتے ہیں ہم، روز بچوں کو پہنے ہوئے دیکھتے ہیں ہم اور پہچان تجھے ہو گی؟'' شہادت کے لئے بندو کو بلوایا گیا۔ چچا نے اس سے پوچھا ''یہ قمیض بنو ہی کی ہے نا؟'' بندو کی کیا مجال کہ میاں کی تردید کرے۔ ڈرتا ڈرتا بولا ''معلوم تو کچھ ان ہی کی سی ہوتی ہے، پر وہ آپ ہی ٹھیک بتائیں گی۔'' بنو کی طلبی ہوئی۔ وہ آتے ہی بولیں ''واہ! یہ پھٹی پرانی قمیض میری کیوں ہوتی، چھٹن ہی کی ہو گی۔'' دھوبن کو چچا کے مزاج کی کیفیت کیا معلوم، کہہ بیٹھی ''میں نہ کہتی تھی۔'' چچا کو آگ لگ گئی۔ ''اولیا کی بچی ہیں نہ یہ تو۔ انہیں کیوں نہ معلوم ہوگا۔ منہ پھٹ بدتمیز کہیں کی۔ دوسرا دھوبی رکھ لوں گا میں۔''

کامل ایک گھنٹے کے بعد کہیں فہرست بن کر تیار ہوئی۔ اب جناب ادھر دھوبن سے کہا گیا کہ تو سب کے کپڑے گن، فہرست کی میزان ملانی شروع کی۔ دھوبن گنتی ہے تو انسٹھ عدد بنتے ہیں۔ چچا اپنی میزان ملاتے ہیں تو اکسٹھ کپڑے ہوتے ہیں۔ دھوبن بار بار کہتی ہے ''میاں ٹھیک طرح جوڑو، انسٹھ ہی ہیں۔'' پر چچا ہیں کہ بگڑے جا رہے ہیں ''تیرا جوڑنا ٹھیک اور ہمارا جوڑنا غلط ہو گیا؟ جاہل کہیں کی۔'' دھوبن غریب بار بار کپڑے گنتی ہے، وہی انسٹھ نکلتے ہیں۔ آخر نئے سرے سے تمام کپڑوں کا مقابلہ کیا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ دھوبن نے بتائے تھے دو جوڑے موزے اور چچا نے لکھے تھے چار۔ دھوبن انہیں دو عدد گنتی تھی اور چچا چار

عدد۔ اس پر پھر بیچاری دھوبن کے لتے لئے گئے ''جوڑی کیا معنی؟ چار نہیں تھے موزے؟ یوں تو چار رومالوں کو بھی دو جوڑی لکھوا دے تو یہ ہمارا قصور ہو گا؟ لے کر اتنا وقت مفت میں ضائع کروا دیا۔ ساری عمر کپڑے دھوتے گزر گئی اور ابھی تک کپڑے گننے کا سلیقہ نہیں آیا۔''

بارہ بجے دھوبن آئی تھی، چار بجے رخصت ہوئی۔ چچا چھکن فراغت پانے کے بعد فہرست چچی کو دینے آئے۔ بولے ''نمٹا دیا ہم نے دھوبن کو۔'' چچی جلی ہوئی تھیں، بولیں ''گھر پر قیامت بھی تو گزر گئی۔ کوئی بچہ ننگ دھڑنگ پھر رہا ہے، کوئی غسل خانے میں کپڑوں کے لئے غل مچا رہا ہے۔ دھوبن دکھیا الگ کھسیانی ہو کر گئی ہے۔ آدھا دن برباد کر کے کس مزے میں کہتے ہیں کہ نمٹا دیا ہم نے دھوبن کو۔'' چچا چڑ گئے ''تمہیں کبھی چھوٹے منہ سے داد کے دو لفظ کہنے کی توفیق نہ ہوئی۔'' چچا روٹھ کر چارپائی پر پڑ رہے۔ چچی نے پوچھا ''پاجاموں میں سے ازار بند بھی نکال لئے تھے؟'' چچا کی آنکھیں کھلیں مگر جواب نہ دیا۔ بڑے مناسب وقت پر روٹھ گئے تھے۔

اتنے میں فہرست دیکھ کر چچی بولیں ''اور یہ میری ریشمی قمیض کون سی؟ ہلکے فیروزی رنگ کی؟ اے غضب خدا کا، میں نے تو وہ استری کرنے کو الگ رکھی تھی۔ دو کوڑی کی کر لائے گی اور اس میں سے میرے سونے کے بٹن بھی اتار لئے تھے یا نہیں؟'' اب تک تو چچا کی تیوری چڑھی ہوئی تھی، سونے کے بٹنوں کا سنا تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے ''بٹن؟ سونے کے؟ تمہارے؟ تمہیں

میری قسم! ہئی ہے! وہ تو نہیں اتارے ہم نے۔"

جوتی پہنے ہوئے چچا باہر بھاگے "ارے بھئی چلی گئی دھوبن! او بندو چلی گئی دھوبن! ارے امامی کدھر گئی دھوبن؟ ارے دوڑیو! ارے بھئی جانا' پکڑنا' لے کر آؤ' منہ کیا تکتے ہو! سونے کے بٹن لے گئی اماں سونے کے بٹن' تمہاری چچی کے۔ اس کا گھر کدھر ہے؟ چوک سے مڑ کر کدھر کو؟ اماں خوانچے والے! کسی دھوبن کو جاتے دیکھا ہے؟ ارے بھئی ریوڑیوں والے! کوئی دھوبن ادھر تو نہیں گئی؟ . . . او بھائی گنڈیریوں والے! کوئی دھوبن . . . دائیں ہاتھ کو؟ اس طرف کو؟ . . . ؟ . . ."

ابھی تک چچا بٹن لے کر واپس نہیں آئے۔

بارش کا پہلا قطرہ

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ

کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیاناس

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹی پتھر تمام ہیں گرم

کس برتے پہ میں کروں دلیری
میں کون ہوں کیا بساط میری

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور

بولا للکار کر کہ آؤ
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مردہ زمین میں جان

کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں
آتے ہو تو آؤ لو چلا میں

یہ کہہ کے وہ ہوگیا روانہ
دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

دیکھی جرات جو اس سخی کی
دو چار نے اور پیروی کی

تصویر: شمس شفیق حسن
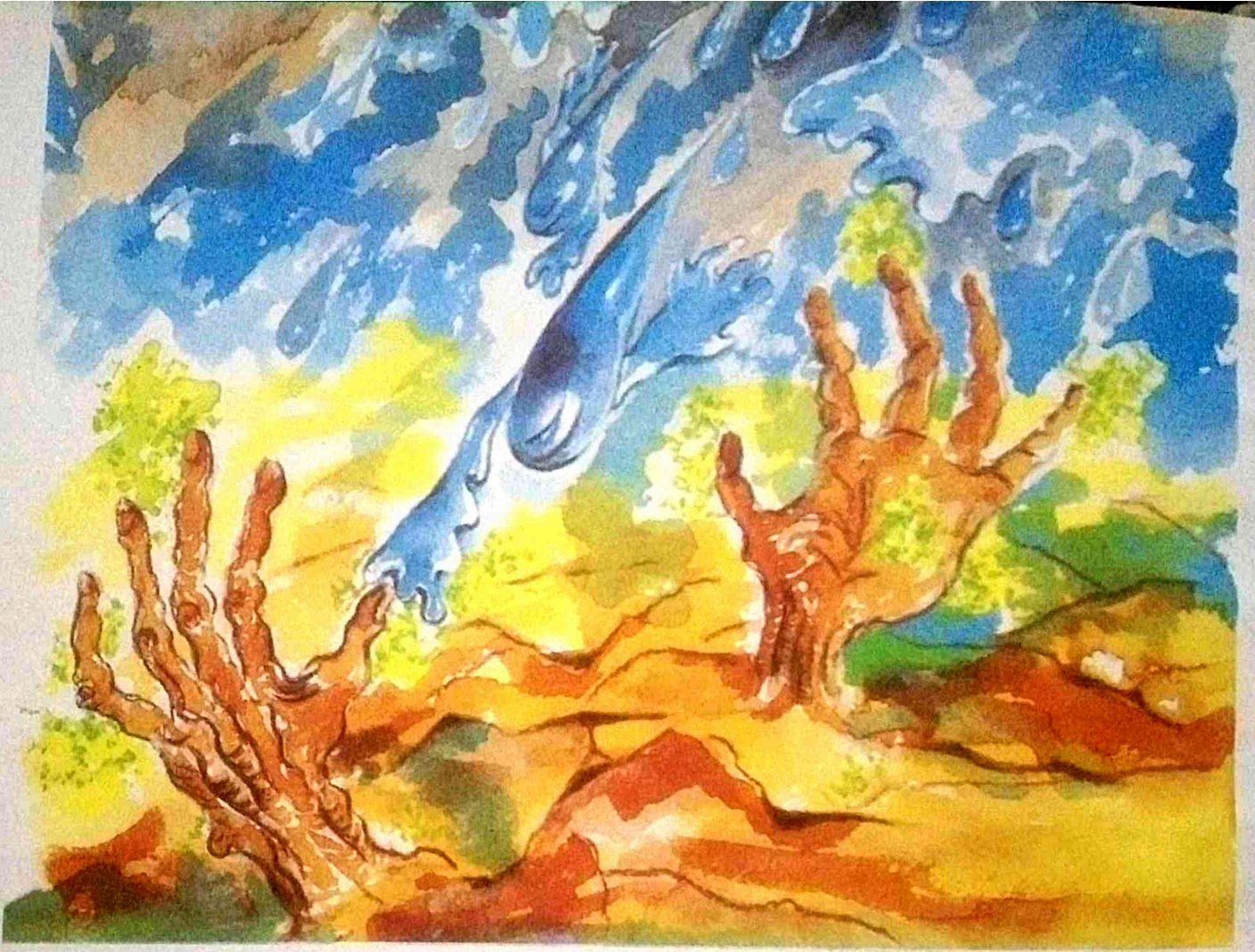
پھر ایک کے بعد ایک لپکا — قطرہ قطرہ زمین پر ٹپکا

آخر قطروں کا بندھ گیا تار — بارش ہونے لگی موسلادھار

پانی پانی ہوا بیاباں — سیراب ہوئے چمن خیاباں

تھی قحط سے پائمال خلقت — اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت

خوشبو کا سفر

تصدق حسین کوثر

فرعون مصر کی ملکہ عابدہ نے سب سے پہلے عطر بنایا۔ اس نے سب سے پہلے مصر کے قدیم متبرک پھولوں کو بکری کی چربی میں ڈال کر تیز دھوپ میں رکھا۔ جب پھول چربی میں پوری طرح تحلیل ہو جاتا تو وہ اسے استعمال کرتی۔ بعد میں وہ چند دوسرے عطر بھی تیار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر ملکہ عابدہ نے اسے صندل اور عنبر کا تحفہ دیا۔ ملکہ عابدہ کے اس انوکھے تجربے کے بعد عطر سازی کی صنعت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

بیش قیمت خوشبوؤں میں چنبیلی، عنصر اور صندل خاص جزو کے طور پر شامل ہوتے ہیں۔ چنبیلی کے پھول زیادہ تر مصر اور جزائر کومور میں پیدا ہوتے ہیں۔ خوشبو (پرفیوم) کی ایک قسم میں کم از کم پچاس سے سو قسموں کے پھولوں کی پتیاں شامل کی جاتی ہیں اس لئے کوئی بھی ملک اکیلا بہترین پرفیوم تیار نہیں کر سکتا۔ وہ بیسیوں قسم کے پھول پتیاں بیرونی ممالک سے درآمد کرتا ہے۔ فرانس میں تیار ہونے والا پرفیوم نہایت قیمتی اور لاجواب ہوتا ہے۔ اس میں ہزاروں قسم کے پھول پتیوں کے علاوہ جانوروں کے وہ اجزاء بھی ملائے جاتے ہیں جنہیں عام حالات میں

کوئی انسان دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ ان میں جنگلی بلی کے گردن کے غدود شامل کیئے جاتے ہیں۔ یہ خوشبو کو دیر تک برقرار رکھنے کے لئے ڈالے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں کوئی ایسی کیمیاوی چیز ملا دی جاتی ہے جو ان کی بدبو کو ختم کر دیتی ہے۔

پرفیوم کا ایک لازمی جزو امکسٹوریم بھی ہوتا ہے جو روسی سائبیریا میں خرگوش کے برابر ایک جانور امکسٹر کی چربی سے تیار کیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ قیمتی خوشبو بنانے کے لئے ایک دوسرا مادہ حبشہ میں پائے جانے والے سیفٹ نام کے جانور سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کا طریقہ نہایت ظالمانہ ہے۔ بلی کے برابر اس ننھے جانور کو زندہ پکڑ کر اس کے جسم کو چھری سے گود دیا جاتا ہے۔ اپنے زخموں کو مندمل کرنے کے لئے یہ جانور ایک خاص قسم کا مادہ خارج کرتا ہے جسے بڑی احتیاط سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ یہی مادہ پرفیوم سازی میں سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور ہزاروں پونڈ فی کلو تک فروخت کیا جاتا ہے۔

پرفیوم میں دوسرا قیمتی مادہ مشک ہے جو ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف سے حاصل ہوتا ہے۔ عطر کا ایک لازمی عنصر عنبر ہوتا ہے جو شارک مچھلی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یہ مچھلی جہاز کے پیچھے چلتی ہے تو رستے میں جو کچھ ملتا ہے اسے ہڑپ کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ جہاز کے چھوڑے ہوئے تیل کو بھی چٹ کر جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے جسم میں

زخم ہوجاتے ہیں۔ زخموں کو مندمل کرنے کے لئے یہ ایک مادہ خارج کرتی ہے جو زخم ٹھیک ہونے کے بعد پانی کی سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ چونکہ شارک مچھلی کافی بڑی ہوتی ہے اس لئے اس کا چھوڑا ہوا یہ مادہ بھی دس دس' پندرہ پندرہ کلو ہوتا ہے اور جس شکاری کے ہاتھ لگ جائے وہ پلک جھپکتے میں لکھ پتی بن جاتا ہے۔

قیمتی پرفیوم کے فارمولے سالہا سال کے پیچیدہ تجربات کے بعد بنائے جاتے ہیں اور پھر ان فارمولوں کی حفاظت کسی سربستہ راز کی طرح کی جاتی ہے تاکہ کسی دوسری کمپنی کو ان کی ہوا تک نہ لگے۔ فرانس اور دیگر ممالک کی پرفیوم ساز کمپنیاں پرفیوم کے جن ماہرین کی خدمات حاصل کرتی ہیں ان کی ناک کا بیمہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس قدر ماہر ہوتے ہیں کہ صرف سونگھ کر بتا دیتے ہیں کہ عطر میں فلاں فلاں اجزا شامل ہیں۔ ان کی ناک بہت حساس ہوتی ہے اور معمولی سے معمولی خوشبو کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ جلد ہی سینے کے امراض اور حساسیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان ہی خطرات کے پیش نظر ان کی ناک کا قیمتی بیمہ کرایا جاتا ہے۔ پرفیوم کمپنی سے باہر فروخت کے لئے اسی وقت جاتا ہے جب یہ ماہرین اسے پاس کر دیں۔

بہن بھائی

فرخندہ لودھی

بھائی سورج اور بہن سحر آپس میں بے حد محبت کرتے تھے۔ سورج سیر کرنے کے لئے باہر نکلتا تو سحر بھی ساتھ ضرور جاتی۔ سحر ہمیشہ سورج کے آگے آگے چلتی تھی۔

ایک دن وہ دونوں بہن بھائی باغ میں کھیل رہے تھے۔ سحر خوشی سے چہکتی پھرتی تھی۔ سورج اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ درختوں پر چڑیوں کے جھرمٹ نے سحر اور سورج کو آتے دیکھا تو چڑچوں، چڑچوں کا الاپ کرنے لگے ''آ گئے، آ گئے . . . بہن بھائی آ گئے . . . ہم کو جگانے آ گئے . . .''

سحر نے دیکھا کہ باغ میں بہت سے پھول ہیں۔ گلاب، گیندا، جوہی، سورج مکھی، گل اشرفی لیکن کچھ جھاڑیاں بالکل چپ سادھے کھڑی ہیں۔ وہ دبے پاؤں آہستہ سے ایک جھاڑی کے پاس گئی اور جھک کر ہولے سے کہا ''چنبیلی! میری سہیلی! چل سیر کو چلیں۔'' چنبیلی کی جھاڑی میں ایک ایک کر کے سارے کے سارے پھول کھل گئے۔

سورج بھی اپنی بہن سحر کے پیچھے پیچھے جھومتا چلا آ رہا تھا۔ بہن کو چنبیلی کے ہمراہ دیکھا تو وہ بھی ایک جھاڑی پر جھک گیا اور آہستہ سے بولا ''موتیئے! میرے لنگوٹیئے! چل سیر کو چلیں۔'' موتیئے نے سورج کی بات سن کر خوشی سے ایک قہقہہ لگایا تو قہہ قہہ کرتے سارے پھول کھل اٹھے۔ باغ میں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل گئی۔ چاروں ساتھی خوب گھومے۔

گرمی بڑھ گئی تو سحر بولی ''سورج بھیا! میں بہت تھک گئی ہوں۔'' اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔ سحر جاتے ہی سو گئی۔ سورج' موتیئے اور چنبیلی نے دن بھر خوب سیر کی۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی۔ اب سورج نے ساتھیوں سے کہا ''دیکھو بھئی دوستو! میں بھی تھک گیا۔ تھوڑا سا ستا لوں۔ شب بخیر۔'' اور پھر وہ سو گیا۔

رات کو سورج کی اچانک آنکھ کھلی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ ''میں بھی کتنا سست ہوں' بہت سوتا ہوں۔ مجھے اب چلنا چاہئے' مگر کیسے؟ رات ہے' اب اگر نکلا تو قیامت آ جائے گی۔ کوئی ترکیب کرنی چاہئے۔ کیوں نہ بھیس بدلا جائے؟'' اور پھر سورج چاند بن گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اسے سحر یاد آ گئی۔ ''سحر . . . سحر . . . بہنا تم کہاں ہو؟'' سحر تو خود بڑی سیلانی تھی۔ وہ جھٹ چاندنی بن گئی اور چاند کی گود سے نکل کر ہر طرف پھیل گئی۔

رات چپ تھی۔ کہیں خوشبو تھی نہ مہک! دھندلی روشنی میں کچھ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔

چاندنی چپکے سے ایک جھاڑ کے پاس اتر گئی اور پوچھا ''کیوں بی! آپ کون ہیں؟'' ''میں . . . میں . . . رات کی رانی ہوں'' جھاڑ نے جھوم کر جواب دیا۔ چاندنی یہ نام سن کر خوشی سے بولی ''واہ واہ رات کی رانی جی! . . . میرے سنگ سیر کو چلتی ہو۔'' رات کی رانی کھل اٹھی اور اس کی خوشبو چاندنی کے ساتھ ساتھ سارے باغ میں بکھر گئی۔

اب چاند بھلا کیوں پیچھے رہتا۔ اس کو بھی ایک دوست مل گیا . . . موگرا۔ موگرا بے چارہ کئی دنوں سے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ چاند نے جب موگرے کو یوں دیکھا تو ہولے سے چاندنی سے کہا۔ ''جا بہنا! موگرے کو بھی جگا۔'' ''اچھا'' چاندنی نے جواب دیا اور پیڑ پر اتر گئی۔ چاندنی کا پاؤں پیڑ پر کیا پڑا موگرے کی تو ساری آنکھیں پھول بن کر کھل اٹھیں۔ ان میں سے بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ اب تو یہ چاروں دوست بہت ہی خوش ہوئے۔

پھر موسم بدل گیا۔ پہاڑوں پر برف گرنے لگی۔ تیز ہواؤں اور موسلا دھار بارش نے درختوں سے پتے گرا دیئے اور جھاڑیوں سے پھول۔ خزان آ گئی، زردی چھا گئی۔

ایک صبح سحر اور سورج حسبِ معمول سیر کو نکلے۔ سحر باغ کی روشوں پر ٹہل رہی تھی کہ اسے ایک ہچکی سنائی دی جیسے کوئی رو رہا ہو۔ وہ آواز کی طرف لپکی چلی گئی۔ رونے کی آواز ایک کیاری میں سے آ رہی تھی۔ ڈنٹھل اور پتے سچ مچ رو رہے تھے۔ سحر نے کیاری کے پاس جا کر

پوچھا ”تم کون ہو؟ کیوں روتی ہو؟“ کیاری میں سے آواز آئی ”میں نرگس ہوں۔ اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ سال ہو گیا مجھ میں کوئی پھول نہیں کھلا۔ تم جانو پھول ہی تو میری آنکھیں ہیں۔ وہ نہیں تو میں اندھی ہوں۔“

تصویر: رومانہ حسین

نرگس کی درد بھری کہانی سن کر سحر کا جی بھر آیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا ''سورج بھیا . . .! نرگس بے چاری رو رو کر بے حال ہو گئی۔ کچھ کرو کہ یہ چپ ہو جائے۔'' سورج نے جواب دیا ''سحر! تو ہنس دے تو یہ بھی ہنسنے لگے گی۔'' سحر مسکرا دی۔ سورج نے بہن کی طرف دیکھا اور بولا ''نہیں بہنا! ایسے نہیں ایسے۔'' اور پھر زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

نرگس کے ڈنٹھل پر پھول کھل گئے اور حیرت سے سورج کا منہ تکنے لگے۔ سحر نے دیکھا کہ نرگس نے اپنے آنسو پونچھ دیئے ہیں اور فضا میں سر اٹھائے کھڑی ہے۔ آنکھوں کے کٹوروں میں سورج کی زردی بھری ہے۔ ارد گرد اجالا ہے، سویرا ہے، میں ہوں!

''لیکن مجھے تو نیند آ رہی ہے!'' سحر نے اپنے آپ سے کہا اور گھر کی طرف چل دی۔ اسے آواز سنائی دی ''مجھے آنکھیں دینے والو، شکریہ . . . شکریہ!'' یہ آواز نرگس کی تھی جو کئی دن تک باغ میں گونجتی رہی۔

لگتا نہیں ہے . . .

بہادر شاہ ظفر

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کٹھ پتلیاں

صدف کلیم

بچو . . . ! انکل سرگم کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ جی ہاں! وہی انکل سرگم جو پاکستان ٹیلی ویژن پر آ کے آپ کو مزے مزے کی باتیں سناتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ انکل سرگم اور ان کے تمام ساتھی دراصل کٹھ پتلیاں ہیں جن کو کچھ اور لوگ حرکت دیتے ہیں اور ان ہی لوگوں کی آوازوں اور جملوں پر ان پتلیوں کے ہونٹ حرکت کرتے ہیں۔ پتلیوں کا تماشا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

ہزاروں سال پہلے بھی لوگ پتلیوں کا تماشا مزے لے لے کر دیکھا کرتے تھے۔ جی جناب . . . پتلیاں ہزاروں سال پہلے بھی اس دنیا میں موجود تھیں۔ آیئے آج آپ کو پتلیوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ اور معلوماتی باتیں بتائیں۔

پتلیاں پرانے زمانے میں چونکہ صرف لکڑی سے بنتی تھیں اس لئے ان کو کٹھ پتلی کہتے تھے۔ اب پتلیاں دوسری بہت سی چیزوں سے بننے لگی ہیں' اس لئے انہیں صرف 'پتلی' بھی کہنے لگے ہیں۔ انگریزی میں انہیں 'پپٹ' کہتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کٹھ پتلیاں چار ہزار سال

پہلے بھی ایشیا کے اس علاقے میں بنتی تھیں جہاں اب پاکستان اور بھارت واقع ہیں۔ اس زمانے میں یہ کٹھ پتلیاں مذہبی ڈراموں میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس قسم کے ڈراموں میں انسانوں کو اداکاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ چین میں بھی دو ہزار سال پہلے پتلیاں نچائی جاتی تھیں۔ مصر' یونان اور روم کے کھنڈرات سے بھی کٹھ پتلیاں ملی ہیں۔

پتلیاں کئی طرح کی ہوتی ہیں اور ان کو نچانے کے طریقے بھی الگ الگ ہیں۔ آیئے ہم آپ کو پتلیوں کی قسموں کے بارے میں بتائیں۔

دستی پتلی: 'دست' کا مطلب ہے 'ہاتھ'۔ اس قسم کی پتلی اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے اور اس میں پتلی نچانے والا اپنا پورا ہاتھ داخل کر دیتا ہے' اس پتلی کی ٹانگیں نہیں بنائی جاتیں۔ اس آدھی پتلی کو کسی میز یا اسٹیج کی آڑ میں اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ لگتا ہے کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس کی ٹانگیں نظر نہیں آتی ہیں۔ پتلی نچانے والا ایک ہاتھ سے اس کے سر کو ہلاتا ہے' دوسرے ہاتھ سے اس کے بازوؤں کو یا انگلیوں کو حرکت دیتا ہے۔ دستی پتلی کا جسم عام طور پر کپڑے سے بنایا جاتا ہے اور سر بنانے کے لئے لکڑی' کاغذ یا ربڑ استعمال کر لیتے ہیں۔ دستی پتلی کو ایک آدمی سنبھال سکتا ہے۔

دھاگا پتلی: باریک ڈوریوں' دھاگوں یا تار کی مدد سے نچائی جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں

تصویر: فیکا

جب لوگوں کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا تو مذہبی رہنما ان پتلیوں کے ذریعے لوگوں کو مذہبی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے ان پتلیوں کو دلچسپ کھیلوں اور تماشوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا تو عبادت گاہوں میں ان پتلیوں کو استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔

دھاگا پتلی کا جسم عام طور پر مکمل ہوتا ہے۔ سادہ قسم کی پتلی میں تین ڈوریاں ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر پتلیاں اب آٹھ یا نو ڈوریوں کی مدد سے نچائی جاتی ہیں۔ عام طور پر پتلیوں کی ڈوریاں ان کے سر، کندھوں، ہاتھوں اور گھٹنوں کو لکڑی کے ایک فریم سے ملاتی ہیں۔ پتلی نچانے والا اسٹیج کے اوپر چھپ کر اس فریم کو حرکت دیتا ہے جس سے ڈوریاں کھنچتی ہیں اور ضرورت کے مطابق پتلی کے ہاتھ پاؤں، سر یا آنکھیں ہلتی ہیں۔

پاکستان میں طویل عرصے تک یہی دھاگا پتلیاں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ پتلی نچانے والے گلی گلی گھوم کر پتلی تماشا دکھایا کرتے تھے۔ وہ چارپائی کی آڑ لے کر بیٹھ جاتے اور ڈوریوں کی مدد سے پتلیوں کو نچایا کرتے تھے۔

سلاخ پتلی: سلاخوں یا چھڑیوں کی مدد سے نچائی جاتی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی پتلی کا جسم مکمل نہیں ہوتا اور اسے بھی اسٹیج پر اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ اس کی ٹانگیں نظر نہ آئیں۔ پتلیوں کے ہاتھوں اور بازوؤں میں سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ سلاخ پتلی کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس

کی مدد سے انسانوں اور جانوروں کے علاوہ دوسری چیزیں بھی بنائی جا سکتی ہیں مثلاً بادل، پھول، درخت، گاڑی وغیرہ۔ سلاخ پتلی کو موڑنا آسان ہوتا ہے۔

سایہ پتلی: اس پتلی کے تماشے میں دیکھنے والے پتلی نہیں بلکہ اس کا سایہ دیکھتے ہیں۔ یوں تو اس قسم کے تماشے میں ہر طرح کی پتلی استعمال کی جا سکتی ہے لیکن عام طور پر کسی بھی انسان یا جانور کی چپٹی سی شکل بنالی جاتی ہے جس کے ساتھ سلاخیں یا تار جڑے ہوتے ہیں۔ پتلی کو ایک باریک ریشمی یا سوتی پردے کے پیچھے نچایا جاتا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ دیکھنے والوں کو تو صرف پردہ نظر آتا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ پتلی کے پیچھے سے اور اوپر سے اس پر تیز روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح پتلی کا سایہ پردے پر پڑتا ہے جو پردے کی دوسری جانب بیٹھے تماشائیوں کو نظر آتا ہے۔

ایک اور قسم کی پتلی 'مپٹ' کہلاتی ہے۔ ''مپٹ'' اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس میں پتلی نچانے والا خود گھس جاتا ہے اور جب وہ چلتا ہے یا ہاتھ ہلاتا ہے تو ''مپٹ'' بھی حرکت کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو مپٹ اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس کے اندر دو دو آدمیوں کو گھسنا پڑتا ہے۔ مپٹ عام طور پر فوم، ربڑ یا پلاسٹک سے بنتی ہیں۔

پتلیوں کی عام قسموں کے علاوہ آبی پتلیاں بھی نچائی جاتی ہیں۔ یہ پتلیاں لکڑی کے ایسے

شہتیروں پر ناچتی ہیں جو جھیل کے پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان پتلیوں سے ڈوریاں بندھی ہوتی ہیں اور خاصی دور سے ان ڈوریوں کو حرکت دے کر ان پتلیوں کو نچایا جاتا ہے۔ آبی پتلیوں کو نچانا آسان کام نہیں ہے اور اس کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتلی نچانے والے سیاہ کپڑے پہن کر بالکل اندھیرے اسٹیج پر آتے ہیں۔ اس طرح وہ تماشائیوں کو نظر نہیں آتے۔ روشنی صرف پتلی پر ڈالی جاتی ہے یا پھر پتلی پر ایسا رنگ کیا جاتا ہے جو روشنی پڑنے سے چمکنے لگتا ہے۔

پتلیوں کو فلموں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ نے فلموں میں بڑے بڑے جانور، گوریلے یا اژدھے وغیرہ دیکھے ہوں گے۔ یہ بھی پتلیاں ہی ہوتی ہیں جنہیں یا تو مشین یا بجلی کی طاقت سے چلایا جاتا ہے یا ریڈیائی لہروں سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔

سادہ سی دستی پتلی تو آپ خود بھی بنا سکتے ہیں۔ جب کسی میز کی آڑ سے آپ اس پتلی کو حرکت دیں گے اور پتلی کی آواز بنا کر بولیں گے تو آپ کے دوستوں کو بڑا لطف آئے گا۔

میرے بچپن کے دن

اے حمید

امرتسر میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا ہمیں شدت سے انتظار ہوتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی مجھے وہ تمام شگفتہ اور پاکیزہ روایات یاد آ جاتی ہیں جو کبھی امرتسر کے جیالے مسلمانوں کی دینی تہذیب کا اہم حصہ تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے مکانوں اور دکانوں میں سفیدیاں کرائی جاتیں، مسجدوں کی تزئین و آرائش کی جاتی۔ نانبائی اور مٹھائی والے اپنی دکانوں کے آگے فالتو تخت پوش لگا کر دکانوں کو بازار کے بیچ تک لے آتے، اوپر قناتیں لگا دی جاتیں۔ افطاری اور سحری کے وقت بجائی جانے والی نوبتیں مسجدوں کے صحن میں نکال کر رکھ دی جاتیں۔ نعت خواں ٹولیاں اپنے اپنے محلوں میں سحری کے وقت پڑھی جانے والی نعتوں کی دہرائی شروع کر دیتے۔ میں اپنے محلے کی نعت خواں پارٹی میں شامل تھا۔ رات کے بارہ بجے تک ہم سارے نعت خواں دکان کا دروازہ بند کر کے نعتیں پڑھتے رہتے۔

یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر ہوگی۔ اس زمانے میں سخت سردیوں میں روزے آتے تھے۔ میں نے گرم کشمیری شال اوڑھ رکھی ہوتی۔ ہم چھ سات محلوں میں روزے

داروں کو جگانے کے بعد سحری شروع ہونے کے وقت واپس اپنی گلی میں آ جاتے۔ مکانوں کے اندر سے پراٹھوں کی خوشبو آ رہی ہوتی تھی۔ میں جلدی جلدی سحری کھا کر اپنی گلی کی مسجد میں آ جاتا۔ مسجد کے فانوس روشن ہوتے، اگربتیاں سلگ رہی ہوتیں، نمازی آ کر وضو کرتے اور خاموشی و ادب سے دریوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور تسبیح و درود میں محو ہو جاتے۔ ہماری مسجد کا بانگی میرا دوست تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ سحری کے بند ہونے پر نوبت میں بجایا کروں گا۔ جوں ہی مولوی صاحب گھڑی کی طرف دیکھ کر سحری کے وقت کے اختتام کا اشارہ کرتے، میں جلدی سے مسجد کے ٹھنڈے یخ صحن میں آتا اور بید کی چھڑیاں ہاتھ میں لے کر دھڑا دھڑ نوبت بجانے لگتا۔ جب تھک جاتا تو میرا موذن دوست یہ فرض انجام دیتا۔

ابھی سائرن بجانے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر بھی استعمال نہیں ہوتے تھے۔ موذن ایسے خوش الحان اور بلند بانگ تھے کہ ان کی آواز دور دور تک سنی جاتی تھی۔ پھر ہم وضو کرتے اور نماز پڑھتے۔ دل میں ایسا جذبہ اور جوش ہوتا کہ مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کبھی ہم گھر آ کر سوتے بھی تھے کہ نہیں۔ اسکول میں ہم اپنے ہندو، سکھ دوستوں کو بڑے فخر سے بتاتے کہ ہم نے روزہ رکھا ہے۔

تصویر: انور جہاں

افطاری کے وقت ہم سب دوست محلے کی مسجد کے صحن میں آ کر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کے گھروں سے افطاری کے خوان آنا شروع ہو جاتے۔ طرح طرح کے کھانے' پھل فروٹ' مٹھائیاں۔ ہمیں کھانے پینے کا لالچ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ یہ سب چیزیں ہمیں اپنے گھروں میں بھی میسر تھیں۔ ایک جذبہ تھا' ایک شوق تھا اس اہتمام میں بھرپور حصہ لینے کا جو افطاری کے وقت مسجد میں کیا جاتا۔

افطاری کے وقت کھانے پینے کی دکانوں کی آرائش بے مثال ہوتی تھیں۔ مٹھائیوں کے تھال اور پھلوں کے ٹوکرے دکانوں سے آگے بازار کے درمیان تک آ گئے ہوتے۔ تنور میں باقر خانیاں' کھنڈ قلچے اور نمکین قلچے تو روز ہی لگا کرتے تھے' لیکن رمضان کے دنوں میں افطاری کے لئے خاص طور پر شیر مال اور اراروٹ تیار ہوتے۔ ان پر خشخاش' تل اور بادام لگے ہوتے۔ ان میں زیرہ بھی پڑا ہوتا تھا۔ نمکین کشمیری چائے کے ساتھ بڑے شوق سے کھایا جاتا۔ کیسے روح پرور' سچے اور اصلی زمانے تھے۔ ملاوٹ کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔

ستائیسویں کی رات کو گلی میں جھنڈیاں لگائی جاتیں' مسجد کو بڑی عقیدت اور جذبے سے آراستہ کیا جاتا' روشنیاں کی جاتیں۔ ساری رات مسجدوں سے قرآن پاک کی تلاوت کی روح پرور آوازیں جاری رہتیں۔ ہم اس رات بالکل نہ سوتے۔ نعت خوانوں کی ٹولیاں دور دور سے

آتیں اور امرتسر شہر کے تقریباً ہر مسلم محلے میں جاتیں۔ مسجدیں روشنیوں سے منور اور خوشبوؤں سے مہک رہی ہوتیں۔

آخری روزے کے دن سحری کے وقت نعت خواں ٹولیوں نے خاصی الوداعی نظمیں بھی شعرا سے لکھوائی ہوتی تھیں۔ ہماری نعت خواں پارٹی کے ماسٹر رفیق خود شاعر تھے۔ مجھے یاد ہے انہوں نے پنجابی کی ایک خاص نظم لکھی تھی جو ہماری پارٹی بڑے درد کے ساتھ سحر کے وقت گلی گلی جا کر گاتی۔

'' الوداع ! ماہِ رمضان پیارا ''

اللہ جانے وہ کیا زمانے تھے' وہ کیا جذبے تھے۔ اس شعر کا ایسا اثر ہوتا کہ ہماری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے تھے۔ میں کئی گلیوں تک اپنی پارٹی کے ساتھ اشکبار آنکھوں سے چلتا چلا جاتا تھا۔ کاش وہ اشک باریاں ایک بار پھر نصیب ہو جائیں۔ وہ رقت' وہ سچائیاں' وہ معصومیت' وہ جذبے ایک بار پھر دلوں میں فروزاں ہو جائیں۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

مردہ بدست زندہ

فرحت اللہ بیگ

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ''واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا دم بھرا جاتا تھا' مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔'' اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے' آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجئے سامنے ہی مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہیں' موٹریں بھی ہیں اور گاڑیاں بھی' غریب بھی ہیں اور امیر بھی۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں' کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں

تصویر: فیکا
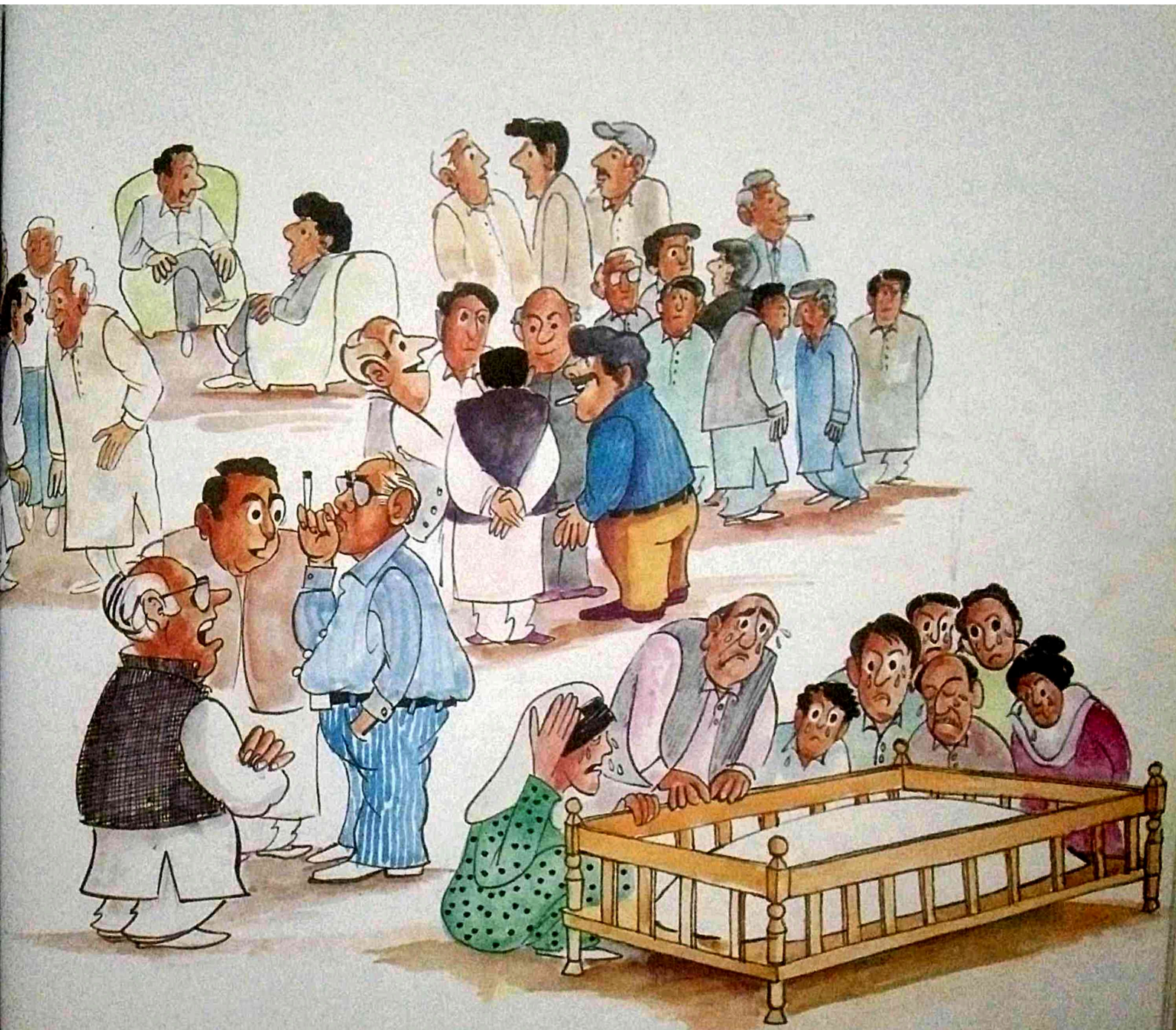
میں بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہے، جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔" اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے، اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازے کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔

ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان کے ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنہیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے۔ ان کے پیچھے وہ لوگ جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرما شری پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔

اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا، گھر بھر کی مزاج پرسی کی، مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے، اور دوسرے وہ جو نہا دھو کر کپڑے بدل کر اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں، یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار، کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی اور یہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سنیئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے، مرنے والے کا نام

پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہوئے گویا صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔ قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔

جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے، کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگانِ خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں، کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا، کچھ ان کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کا نکال لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمینٹ ہے اور ہر

قبر ایک اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں کی بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے' نہیں ہو رہا تو وہ جو ہونا چاہئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے' کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ دو صاحبوں نے میت کو اٹھایا۔ میت قبر کے منہ تک آ گئی اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے "ہاں ہاں۔ ذرا اور جھکا کر ... ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ۔ بس بھئی۔ "کوئی چیخ رہا ہے۔" ارے میاں منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ بس بھئی بس۔ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ جو بیچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

جب اس کام سے فراغت پائی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہو گا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں

گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

ایک آرزو

علامہ محمد اقبال

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ میری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

عمر ماروی

محمد عبدالجبار نیازی

سندھ میں ضلع تھرپارکر کے تعلقہ نگرپارکر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام ملیر تھا۔ وہاں ایک غریب چرواہا رہا کرتا تھا۔ ماروی اسی چرواہے کی بیٹی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر حسین تھی۔ اندھیروں میں کسی چراغ کی مانند' صحرا میں پھول کی طرح۔ آس پاس کے لوگ اس کو دیکھ کر کہتے "ماروی' تمھیں تو کسی محل میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔" وہ سادگی سے جواب دیتی "پھول باغوں ہی میں نہیں صحرا میں بھی کھلتے ہیں۔"

ماروی اور اس کی قوم سادہ زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ وہ لوگ سادہ غذا کھاتے' موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے۔ ماروی کو اپنے لوگوں سے بے حد پیار تھا۔ وہ اپنے صحرا سے بھی محبت کرتی تھی۔

ایک یتیم بچہ پھوگ اس کے خاندان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ بچپن میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلا کرتے لیکن جب بڑے ہوئے تو دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو گئے۔ ماروی بہت مخلص تھی جبکہ پھوگ ایک خودغرض شخص تھا۔

تصویر: ارم فاطمہ کھانڈوالا

ایک دن پھوگ نے ماروی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ ماروی نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا ''نہیں پھوگ، ہماری قدریں بالکل مختلف ہیں۔'' پھوگ خاموش ہو گیا۔

کھیت ماروی کا عم زاد تھا جو قریب کے گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اپنے ارادوں کا پکا اور بات کا کھرا۔ وہ اپنے لئے بھی صاف اور سچا تھا اور دوسروں کے لئے بھی۔ ماروی اور کھیت دونوں شادی کے لئے ایک دوسرے سے منسوب کر دیئے گئے۔

پھوگ نے ملیر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ملیر سے وہ سیدھا عمرکوٹ پہنچا۔ ان دنوں سندھ کا حاکم عمر سومرو تھا اور اس کا دارالحکومت عمرکوٹ تھا۔ پھوگ کسی نہ کسی طرح عمر سومرو کی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے عمر کا اعتماد حاصل کر لیا۔

عمر خوبصورت عورتوں کا دلدادہ تھا۔ اس کے محل میں سندھ کے ہر علاقہ کی دوشیزائیں موجود تھیں۔ ایک دن باتوں باتوں میں پھوگ نے عمر سے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عورتیں بہت خوبصورت ہیں لیکن سندھ کی سب سے خوبصورت دوشیزہ ان میں نہیں ہے۔ پھوگ کے اس فقرہ سے عمر کو تجسس پیدا ہوا اور اس نے پھوگ سے سوال کیا ''کون ہے وہ؟'' پھوگ نے بتایا ''وہ ماروی ہے۔ ملیر کے ایک غریب چرواہے کی بیٹی۔'' عمر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ماروی کو خود دیکھنے جائے گا۔ اس نے پھوگ کو ساتھ لیا اور دونوں بھیس بدل کر ملیر جا پہنچے۔

تصویر: ارم فاطمہ کاپڑوالا
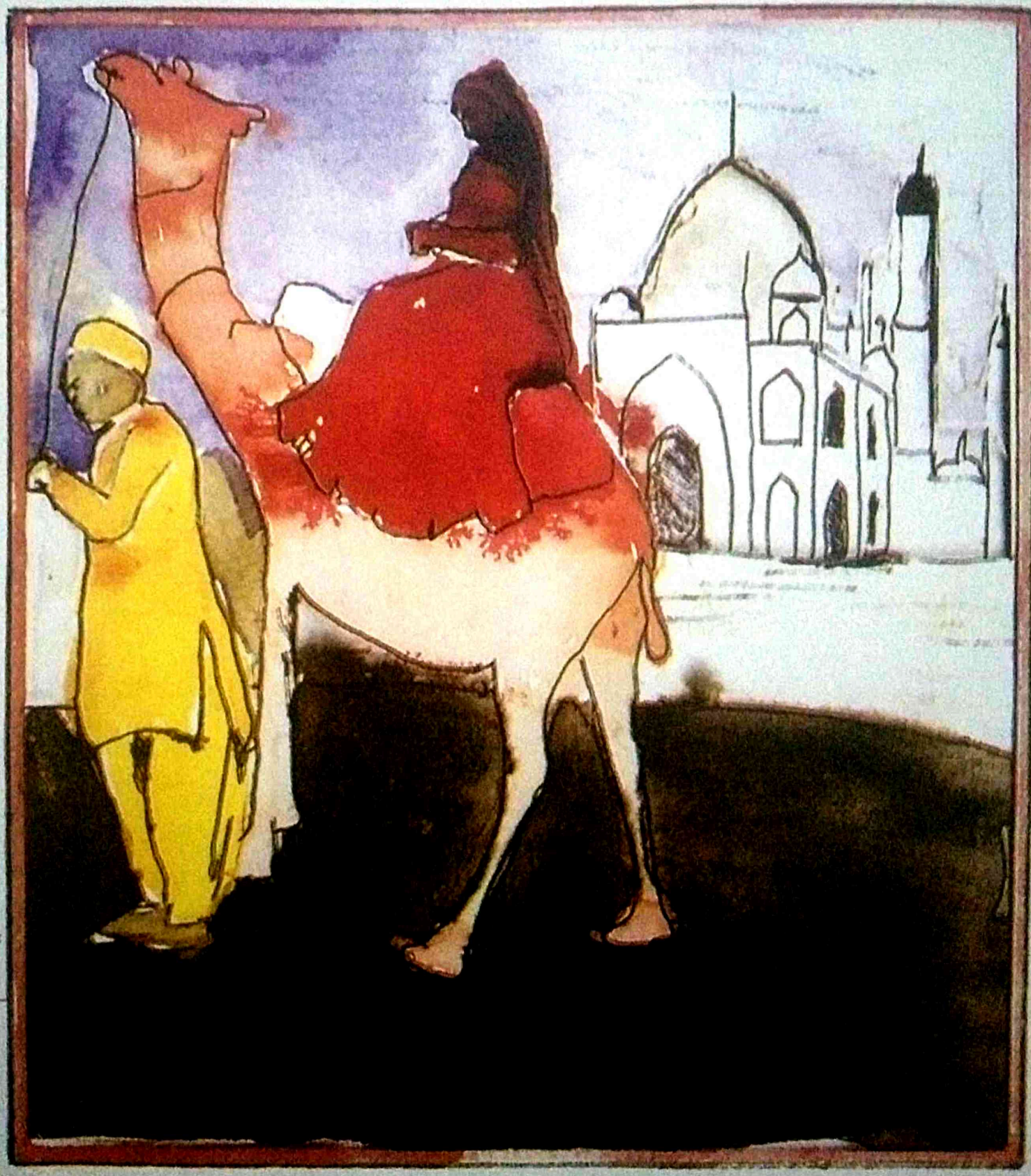
وہاں انہوں نے ماروی کو گاؤں کے کنوئیں پر پا لیا۔ عمر نے ماروی کو اپنے تصور سے بھی بڑھ کر خوبصورت پایا اور ارادہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر ماروی کو حاصل کر کے رہے گا۔ پھوگ نے مزید اکسایا کہ ماروی کی منگنی ہو چکی ہے لیکن سندھ کے بادشاہ ہونے کی حیثیت سے عمر کا حق بنتا ہے کہ سندھ کی خوبصورت ترین دوشیزہ اس کے محل کی زینت بنے اور بادشاہ کو اپنا یہ حق استعمال کرنا چاہیے۔ عمر کا ماروی کو حاصل کرنے کا جنون اور بڑھ گیا۔ چند دنوں تک دونوں گاؤں میں مٹرگشت کرتے رہے اور آخر ایک دن موقع پا کر انہوں نے ماروی کو اغوا کر لیا اور عمرکوٹ لے آئے۔

محل میں پہنچ کر عمر نے ماروی کو اپنی ملکہ بنانے کی پیشکش کری۔ لیکن ماروی نے اسے رد کر دیا۔ اس نے ماروی کو جاہ و مرتبہ اور خزانہ سب کچھ پیش کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے والدین کو دولت اور خزانوں کے انبار سے ڈھک دے گا۔ یہ بھی کہا کہ اس کا بیٹا تخت و تاج کا وارث ہو گا۔ ماروی نے عمر کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس نے اپنے دیہاتی لباس تک کو الگ نہیں کیا۔ نہ تو بالوں میں تیل دیا نہ کنگھی چوٹی کی اور اپنے خوبصورت چہرے کو گرد و غبار میں اٹ لیا۔ آخر عمر نے ماروی سے کہا کہ وہ اس کو ایک سال کے لئے اپنے محل میں رکھے گا اور اگر اس مدت میں بھی اس کی محبت ماروی کے دل پر اثر نہ کر سکی تو وہ آزاد کر دی جائے گی۔

اس ایک سال میں عمر ماروی کا دل نہ جیت سکا۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اپنے لوگوں اپنے صحرا اور اپنے منگیتر کھیت کے پاس واپس لوٹ جائے۔ عمر نے اپنا وعدہ نبھایا اور اسے ملیر چھوڑ آیا۔

جب ماروی ملیر واپس آئی تو سندھ کے رسم و رواج کے مطابق اسے کاری کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کے باپ نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر اسے اس ظلم سے بچانے کے لئے صحرا میں چھوڑ دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ماروی کے گیت کی گونج صحرا میں اب بھی سنائی دیتی ہے۔

تصویر: نائلہ

عمرکوٹ کا قلعہ

عمرکوٹ

حیدر آباد کے مشرق میں تھر کے ریگستان کے کنارے ایک پرانا شہر عمرکوٹ واقع ہے۔ یہ سومرو حکمرانوں کے زمانے میں (1350 - 1050) سندھ کا دارالحکومت تھا۔ عمرکوٹ کا قلعہ شاید سومرو بادشاہ عمر نے 1226 میں تعمیر کیا تھا۔ قلعہ کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی 17 فٹ چوڑی فصیل ہے۔ یہ قلعہ سندھ اور پاکستان کا ثقافتی ورثہ ہے۔

عمرکوٹ میں مغل شہنشاہ اکبر کی پیدائش ہوئی تھی۔ 1542 میں شہنشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ایران جا رہا تھا تو راستے میں راجپوت بادشاہ رانا پرشاد نے عمرکوٹ کے قلعے میں اسے مہمان ٹھہرایا تھا۔ شہنشاہ اکبر کی ولادت اسی دوران ہوئی تھی۔
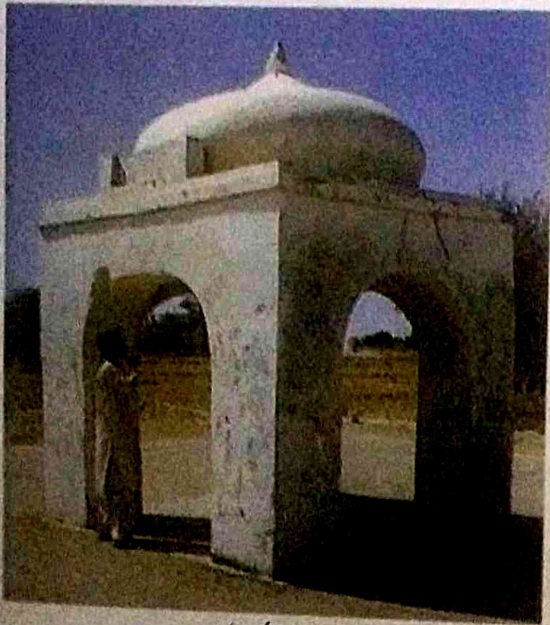
عمرکوٹ میں شہنشاہ اکبر کی پیدائش کی یادگار
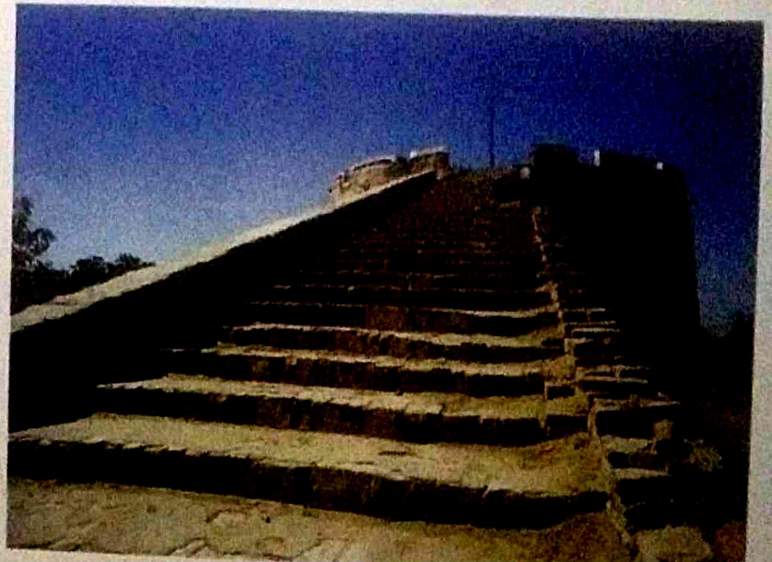
قلعہ کے اندر بنی ہوئی سیڑھیاں

مولوی نذیر احمد

قمر جہاں

ذہانت اور شوخی سے بھری ہوئی روشن اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، بھاری جسم، بڑا سا گھٹا ہوا سر، شگفتہ مزاج، باہر نکلے تو بہترین لباس میں ملبوس، کبھی جبہ، کبھی اچکن اور کبھی گاؤن۔ سر پر ترکی ٹوپی اور کبھی صافہ، پیروں میں کبھی سلیم شاہی اور کبھی انگریزی جوتا۔ گھر میں ہیں تو لباس سے بے نیاز تہمد باندھے بیٹھے ہیں۔

یہ مختصر سا خاکہ اردو کے مایہ ناز مصنف نذیر احمد کا ہے۔ انہیں اردو زبان کا پہلا ناول نگار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ اردو، فارسی اور عربی پر عبور رکھتے تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ وہ بیک وقت مولوی بھی تھے اور مترجم قرآن بھی، مصنف بھی تھے اور مقرر بھی، انسپکٹر اسکول اور ڈپٹی کلکٹر بھی اور ساتھ ہی سرسید کی تحریک میں برابر کے شریک بھی۔

نذیر احمد، انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ تھے۔ بہت ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ عادتیں ایسی بھی تھیں جو ان کے نقطہ نظر سے شاید درست ہوں لیکن دوسرے ان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو پڑھاتے وقت بھی کھاتے لیکن کبھی کسی شاگرد سے کھانے میں شریک

ہونے کو نہ کہتے۔ فرحت اللہ بیگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ''کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے' بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزے کا آم ہے۔ مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔''

مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا ان کو بہت شوق تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے لیکن دی ہوئی رقم کا پورا پورا حساب رکھتے۔ دیئے ہوئے روپے پر سود ضرور لیتے اور اسے جائز سمجھتے۔ کوئی حجت کرتا تو اسے دلیلوں سے قائل کرتے اور بقول فرحت اللہ بیگ '' ایک تو حافظ دوسرے عالم تیسرے لسان۔ بھلا ان سے کون در آ سکتا تھا۔''

ان کا تعلق دلی کے ایک غریب مولوی گھرانے سے تھا لیکن انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد کے سبب نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ دولت' عزت اور شہرت سب ہی ان کے حصے میں آئی۔

ان کے تعلیمی سفر کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عجیب وغریب بھی۔ بقول ان کے تعلیم کا شوق انہیں مولوی عبدالخالق کے مدرسے تک لے آیا۔ اس مدرسے کے کچھ طلباء کا گزارا پڑوس اور محلے کے گھروں سے روٹی سالن مانگ کر ہوتا تھا۔ نذیر احمد بھی کبھی گھر گھر جا کر روٹی جمع کرتے۔

محلے میں ایک گھرانہ ایسا بھی تھا جہاں ایک شریر اور نٹ کھٹ سی لڑکی رہتی تھی۔ وہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے بدلے نذیر احمد سے محلے بھر کا مسالہ پسوایا کرتی اور وہ پیسنے میں سستی کرتے تو ہاتھوں پر بٹہ مارتی۔ خود فرماتے ہیں ''خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مسالہ اٹھا لاتی تھی' پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں ہاتھ روکتا وہ بٹہ انگلیوں پر مارتی۔'' مزے کی بات یہ ہے کہ بڑے ہو کر اسی لڑکی سے نذیر احمد کی شادی ہوئی۔

مسجد میں نذیر احمد کی تعلیم جاری تھی کہ ایک روز پھرتے پھراتے دہلی کالج کی طرف نکل گئے۔ معلوم ہوا کہ مدرسے میں داخلے کے لئے بچوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ آپ بھی اس بھیڑ میں گھس گئے۔ امتحان لیا گیا تو اس میں پورے اترے اور مدرسہ میں داخلہ بھی ملا اور وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ یہیں سے نذیر احمد نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ انگریزی حکومت نے تعزیرات ہند کی دفعات کا ترجمہ کرنے کے لئے جو ٹیم مقرر کی تھی اس میں آپ بھی شامل تھے اور بقول ان کے ''یہی میری ترقی کا زینہ تھا۔''

مترجم کی حیثیت سے تو وہ اپنے آپ کو منوا چکے تھے لیکن مصنف کی حیثیت سے انہیں اس وقت تک کوئی نہ جانتا تھا۔ 'چند پند' انہوں نے اپنے بیٹے اور 'مراۃ العروس' انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے لکھی۔ یہ کتابیں کہانی کی شکل میں تھیں اور ایک اچھے لڑکے اور لڑکی کی تربیت کی

غرض سے لکھی گئی تھیں لہذا انہیں نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ ان پر نذیر احمد کو انعام بھی ملا۔ مزید کتابیں لکھنے کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ پھر کیا دیر تھی زبان اپنی خیالات اپنے کتابوں پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ شمس العلماء اور خان بہادر جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ اس طرح آپ قرار پائے اردو کے پہلے ناول نگار۔ جہاں قلم پرزور تھا وہاں زبان بھی تقریر میں جادو جگاتی تھی۔ سرسید احمد خان کے مشن کو آگے بڑھانے میں جس مالی امداد کی ضرورت تھی اس کا بیشتر حصہ آپ کی پرجوش تقاریر کا مرہون منت ہے۔

نذیر احمد نے اردو میں پہلی بار جنوں، بھوتوں، پریوں سے ہٹ کر اپنے گرد و پیش کے حالات اور عام لوگوں کے معمولات کو کہانیوں کی شکل میں پیش کیا اور ناول کی صنف کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کیا۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ آپ اپنے کرداروں کے نام ان کی خصوصیات کے مطابق رکھتے تھے۔ مثلاً ابن الوقت، مرزا ظاہر بیگ، تمیزدار بہو، مزاج دار بہو، تماشا خانم وغیرہ۔

نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔ جب تک زندہ رہے اپنے آپ کو فعال رکھا اور علم بانٹتے رہے۔ ان کا شمار آج بھی اردو کے صف اول کے مصنفین میں ہوتا ہے۔

مولوی نذیر احمد کی تحریروں سے کچھ اقتباسات

توبتہ النصوح میں نصوح اپنی بیماری اور خیالات میں تبدیلی کے بعد اپنی بیوی فہمیدہ سے اپنے بچوں کی صحبت وعادات اور تربیت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اپنے لڑکوں کی وضع قطع اور طور طریقوں سے وہ انتہائی نالاں ہے چنانچہ کہتا ہے:

"۔ ۔ ۔ ایک نابکار کو دیکھو کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے۔ کبھی سینے پر نظر ہے کبھی بازوؤں پر نگاہ ہے آدم زاد ہو کر لقا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے۔ اتنا اکڑتا ہے اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدی میں جا لگی ہے۔ کپڑے ایسے چست کہ گویا بدن پر ہی سیئے گئے ہیں ۔ ۔ ۔"

دوسرا ناہنجار صبح اٹھا اور کبوتر کھول باپ دادا کا نام اچھالنے کوٹھے پر چڑھا۔ پھر سوا پہر دن چڑھے تک وہیں دھا چوکڑی مچائی۔ مارے باندھے مدرسے گیا۔ عصر کے بعد پھر کوٹھا ہے اور کنکوا ہے ۔ ۔ ۔

تیسرے نالائق بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ! محلہ نالاں، ہمسائے عاجز، اس کو مار اس کو چھیڑ، چاروں طرف ایک تراہ تراہ مچی رہی ہے ۔ ۔ ۔ ان کی حرکات و سکنات، نشست و برخاست کوئی بھی تو بھلے مانسوں کی سی نہیں، گالی دینے میں ان کو باک نہیں، فحش بکنے میں ان کو تامل نہیں، قسم ان کا تکیہ کلام، نہ زبان کو روک نہ منہ کو لگام ہے۔

فسانہ مبتلا میں مبتلا اپنی پہلی بیوی غیرت بیگم سے دوسری بیوی کی آمد کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ غضبناک ہو کر یوں جواب دیتی ہے:

"... واہ چوری اور سر زوری! آج کو بڑے ماموں جان ہوتے تو الٹے استرے سے مردار کا سر منڈوا دیتے اور تم کو تو اپنی لاج کا پاس لحاظ آج کیا برسوں سے نہیں۔ بڑے ماموں جان کی زندگی تک چوری چھپے کرتے تھے وہ مرے تو کھل کھیلے۔ مردانہ مکان تو مدتوں سے کنچنیوں کا چکلہ ہو رہا ہے' ایک زنانہ مکان بچا تھا سو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اس کی تاک میں لگے ہو مگر جب تک میں جیتی ہوں دیکھوں تو کون رستم کی جنی میری ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتی ہے۔ اپنا اس کا خون ایک کردوں تو سہی ..."

قطعات اور رباعیات

قطعہ: قطعہ کے لفظی معنی ہیں ٹکڑا۔ اردو شاعری میں قطعہ ایک صنف نظم ہے جو عموماً چھ سات اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ردیف و قافیہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ کبھی غزل کی طرح ہر شعر کے پہلے مصرعے کا قافیہ الگ ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی مثنوی کی طرح ہر شعر کے دونوں مصرعے الگ الگ قافیہ رکھتے ہیں۔ اس میں عام طور پر کوئی مختصر واقعہ، نصیحت یا اخلاقی نکتہ بیان کیا جاتا ہے۔ بعض قطعات کسی ایک چیز کی تعریف میں بھی کہہ دیئے جاتے ہیں۔

کوکتی ہے شمال میں کوئل
ہل کسانوں نے کر لئے تیار
گلہ بانوں پر کیف طاری ہے
دیکھ کر یہ فضائے خوش آثار
ابر باراں کے پیرہن میں آج
کتنا پرکیف ہے جمال یار

شاہ عبداللطیف بھٹائی

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ گر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈرس
سیدھے الہ آباد میرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

اکبر الہ آبادی

مصائب یہ کرتی ہے جس درجہ پیدا
خوشی اس قدر یہ دکھاتی نہیں ہے
زباں ہو اگر اپنے قابو میں ہم دم
مصیبت کوئی پاس آتی نہیں ہے

خوشحال خان خٹک

رباعی: جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے رباعی چار مصرعوں کی مختصر سی نظم کو کہتے ہیں۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرے مصرعے کا قافیہ مختلف ہوتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود اس میں کہانی کے پلاٹ کی طرح ربط ہوتا ہے یعنی پہلے مصرعے میں کسی خاص موضوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اور چوتھا مصرعہ حاصل کلام ہوتا ہے۔

رباعی ان اصناف نظم میں سے ہے جو عربی اور فارسی سے ہوتی ہوئی اردو تک پہنچی۔ قدیم زمانے کے شاعر رباعی میں فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین یا نصیحت نظم کرتے تھے۔ آج کل کے شعراء مزاحیہ مضامین بھی ادا کرتے ہیں۔

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر انیس

تیمور نے ایک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سطحِ بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیش ہمت دشوار

خواجہ الطاف حسین حالی

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے
دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص و خود بینی
اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

اکبر الہ آبادی

ماسٹر صاحب

شوکت تھانوی

''آخر یہ کب تک یوں ہی گلی ڈنڈا اڑاتا پھرے گا؟ تم کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے۔'' والدہ صاحبہ نے اس خاکسار کے متعلق یہ الفاظ والد صاحب سے اس وقت کہے جب وہ بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے رات کو حقہ پیتے پیتے سو جانے کے قریب تھے۔ چنانچہ انہوں نے گویا چونک کر جواب دیا ''ایں کیا کہا؟ تعلیم کا زمانہ نکلا جا رہا ہے؟ حالانکہ اب تعلیم کا زمانہ آیا ہے۔ بہر حال میں خود اس فکر میں ہوں کہ کوئی معقول سا ماسٹر مل جائے تو اس کو پڑھنے بٹھا دوں۔''

اس واقعہ کے تین یا چار دن کے بعد ایک ادھیڑ عمر انسان' بحثیت ماسٹر کے' والد صاحب خدا جانے کہاں سے پکڑ لائے اور ہم کو ان حضرت کے سپرد کر دیا۔ لہذا ہم نے ان سے شرف تلمذ حاصل کرنا شروع کر دیا اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈر کے علاوہ کنگ پرائمر کا سبق بھی لینے لگے۔ اگر استاد قابل اور شاگرد ذہین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ چار پانچ مہینہ کے اندر ہم نے اردو ریڈر بھی بفضلہ ختم کر دی اور کنگ پرائمر کے پندرہ سولہ صفحے پڑھ ڈالے۔ اس کے علاوہ اے' بی' سی' ڈی مختلف

طریقوں پر لکھنا سیکھ گئے اور سو تک کے ہندسے اردو اور انگریزی میں لکھنا سیکھ لئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ چار پانچ مہینہ میں اس سے زیادہ ایک ماسٹر اور کیا پڑھا سکتا تھا اور ایک ذہین شاگرد اور کیا پڑھ سکتا تھا؟ مگر باوجود ماسٹر صاحب کی اس محنت اور ہماری ذہانت کے والدہ صاحبہ کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ ماسٹر صاحب کچھ پڑھاتے وڑھاتے نہیں ہیں اور ہمیشہ جلدی چھٹی دے دیا کرتے ہیں۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ ماسٹر صاحب بے چارے ہم کو دو گھنٹہ روز پڑھانے پر ملازم تھے مگر ہم کو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھایا ہو۔ پہلے تو آتے ہی ہم کو اردو ریڈر کا سبق اس طرح پڑھایا کہ خود پڑھتے گئے اور ہم سے کہا کہ آواز سے آواز ملا کر تم بھی پڑھتے جاؤ۔ چنانچہ ماسٹر صاحب کتاب دیکھ کر پڑھاتے تھے اور ہم ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہراتے تھے۔ اس کے بعد کل کا سبق اس طرح سنتے تھے کہ ہمارے آگے کتاب رکھ دی اور کہا سناؤ سبق۔ ہم کبھی کتاب دیکھتے اور کبھی ماسٹر صاحب کا منہ۔ اس کے بعد وہ خود ہی کہتے:۔

"رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی"
ماسٹر صاحب خوش ہو کر کہتے تھے "شاباش! ہاں اور آگے"

"اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں"

ہم ماسٹر صاحب کی آواز سے آواز ملا کر یہ شعر بھی پڑھ دیتے۔ لیجئے قصہ ختم، گویا سبق یاد ہے۔

اس کے بعد اسی طرح کنگ پرائمر کا سبق پڑھایا اور سنا جاتا تھا۔ پھر ماسٹر صاحب سلیٹ ہمارے سامنے رکھ کر ہمارا ہاتھ جس میں سلیٹ کی پنسل ہوتی تھی، قلم کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر گنتی لکھنا شروع کرتے تھے اور کوئی پانچ ہی منٹ میں یہ کام بھی ختم ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ آدھ گھنٹے کے اندر اردو، انگریزی اور حساب کی مکمل تعلیم ہو جاتی، اور یہی بات والدہ صاحبہ کو ناگوار ہوتی تھی۔

بہرحال ہماری تعلیم جاری تھی اور ہم فاضل ہو جانے کے قریب ہی تھے کہ ایک دن والد صاحب کو بھی ذرا ہماری تعلیم کا خیال آیا اور انہوں نے ہم کو پاس بلا کر پوچھا "تم نے انگریزی کہاں تک پڑھ لی؟" ہم نے کہا "آدھی کتاب پڑھ چکے ہیں۔" والد صاحب نے اپنا انگریزی اخبار اٹھا کر ایک موٹے سے حرف پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہ کونسا حرف ہے؟" ہم نے اس حرف کو گھور کر دیکھا اور غور کرنا شروع کیا کہ یہ کونسا حرف ہو سکتا ہے؟ مگر کافی غور کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ خواہ کوئی بھی حرف ہو بہرحال ہماری کتاب میں نہیں ہے۔ والد صاحب نے کہا "بتاؤ یہ کونسا حرف ہے؟" ہم نے جواب دیا "یہ حرف تو ہم نے نہیں پڑھا۔" والد صاحب

نے کہا ''ایں کیا کہا؟ یہ حرف تم نے نہیں پڑھا اور آدھی کتاب پڑھ گئے؟ اچھا یہ کونسا حرف ہے؟ ایک اوپر کے حرف پر والد صاحب کی انگلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ حرف بھی کچھ عجیب قسم کا تھا گویا چائے کی پیالی کا ٹوٹا ہوا کنڈا۔ ہم نے اسے غور سے دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا ''ہمیں نہیں معلوم۔'' ایک تیسرے حرف پر والد صاحب نے انگلی رکھ دی۔ یہ حرف بالکل ڈلی کاٹنے کے سروتے کی طرح تھا اور غالباً حرف نہیں تھا بلکہ سروتا ہی تھا۔ لہذا ہم نے کہا ''سروتا ہے۔'' والد صاحب نے حیرت سے کہا ''کیا کہا' سروتا ہے' سروتا کیا؟'' ہم نے والد صاحب کی محدود معلومات پر ہنستے ہوئے کہا ''آپ کو معلوم نہیں سروتا کس کو کہتے ہیں؟ جس سے ڈلی کاٹی جاتی ہے۔'' والد صاحب نے ہم کو اور اس حرف کو یکے بعد دیگرے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ ڈلی کاٹنے کا سروتا ہے؟ کیا تمہارے ماسٹر نے یہی تم کو بتایا ہے؟'' ہم نے کہا ''نہیں ماسٹر صاحب نے تو نہیں بتایا میں خود ہی کہہ رہا ہوں۔'' والد صاحب نے کہا ''اچھا اپنی سب کتابیں لاؤ۔'' ہم اپنی کتابیں لے آئے اور والد صاحب نے کنگ پرائمر لے کر پوچھنا شروع کیا ''ریٹ معنی؟'' ہم نے جلدی سے کہا ''ایم اے این ریٹ معنی آدمی۔'' والد صاحب نے ذرا تیز آواز میں پوچھا ''ایم اے این ریٹ ہوا؟'' ہم نے گھبرا کر ''جی' جی نہیں۔ ایم اے این شاید کیٹ ہوا۔ کیٹ معنی بلی۔'' والد صاحب نے کنگ پرائمر رکھ کر کہا ''ماشاء اللہ! خوب ان ماسٹر صاحب نے پڑھایا ہے اور خوب آپ نے پڑھا ہے۔اچھا ذرا اردو کی کتاب تو لائیے جو آپ ختم کر چکے ہیں۔''

ہم نے کتاب دے دی اور والد صاحب نے کتاب کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی کہ پڑھو۔ مگر آپ ہی بتائیے کہ یہ بھی پڑھنے کا کوئی طریقہ تھا کہ ہم خود بخود پڑھنے لگیں۔ ہم انتظار

کرنے لگے کہ اب والد صاحب پڑھیں گے اور ہم کو آواز سے آواز ملا کر پڑھنا پڑے گا مگر بجائے اس کے کہ وہ پڑھتے، انہوں نے پھر کہا "پڑھو بھائی پڑھتے کیوں نہیں؟ یہ کتاب تو تم ختم کر چکے ہو۔" ہم نے کہا "جی ہاں، یہ تو بہت دن ہوئے ختم ہو گئی۔ آپ پڑھیے تو میں بھی پڑھوں۔" والد صاحب نے کہا "میں پڑھوں یعنی میں؟ کیا مطلب اس سے۔" ہم نے کہا "جی ہاں آپ پڑھیے گا جب ہی تو ہم پڑھیں گے۔" والد صاحب نے انتہائی حیرت سے کہا "میں پڑھوں گا، جب تم پڑھو گے؟ یہ کیا! تو کیا تم کو اسی طرح پڑھایا گیا ہے؟" ہم نے کہا "جی ہاں ہم کو ماسٹر صاحب نے اسی طرح . . ." اتنے میں ماسٹر صاحب نے باہر سے آواز دی اور والد صاحب نے ہم سے کہا کہ "جاؤ ماسٹر صاحب آگئے ہیں پڑھو جا کر۔"

ہم نے باہر جاتے ہی ماسٹر صاحب سے آج کے امتحان کا ذکر کیا اور اس کے بعد کل کا سبق سنانے بیٹھ گئے۔ ماسٹر صاحب نے کہا "ہاں کل کا سبق سناؤ۔"

"رات گزری نور کا تڑکا ہوا"

ہم نے کہا "رات گزری نور کا تڑکا ہوا"

ماسٹر صاحب نے پڑھا ع

"ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا"

ہم نے آواز ملا کر پڑھا "ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا"

تصویر: فیکا
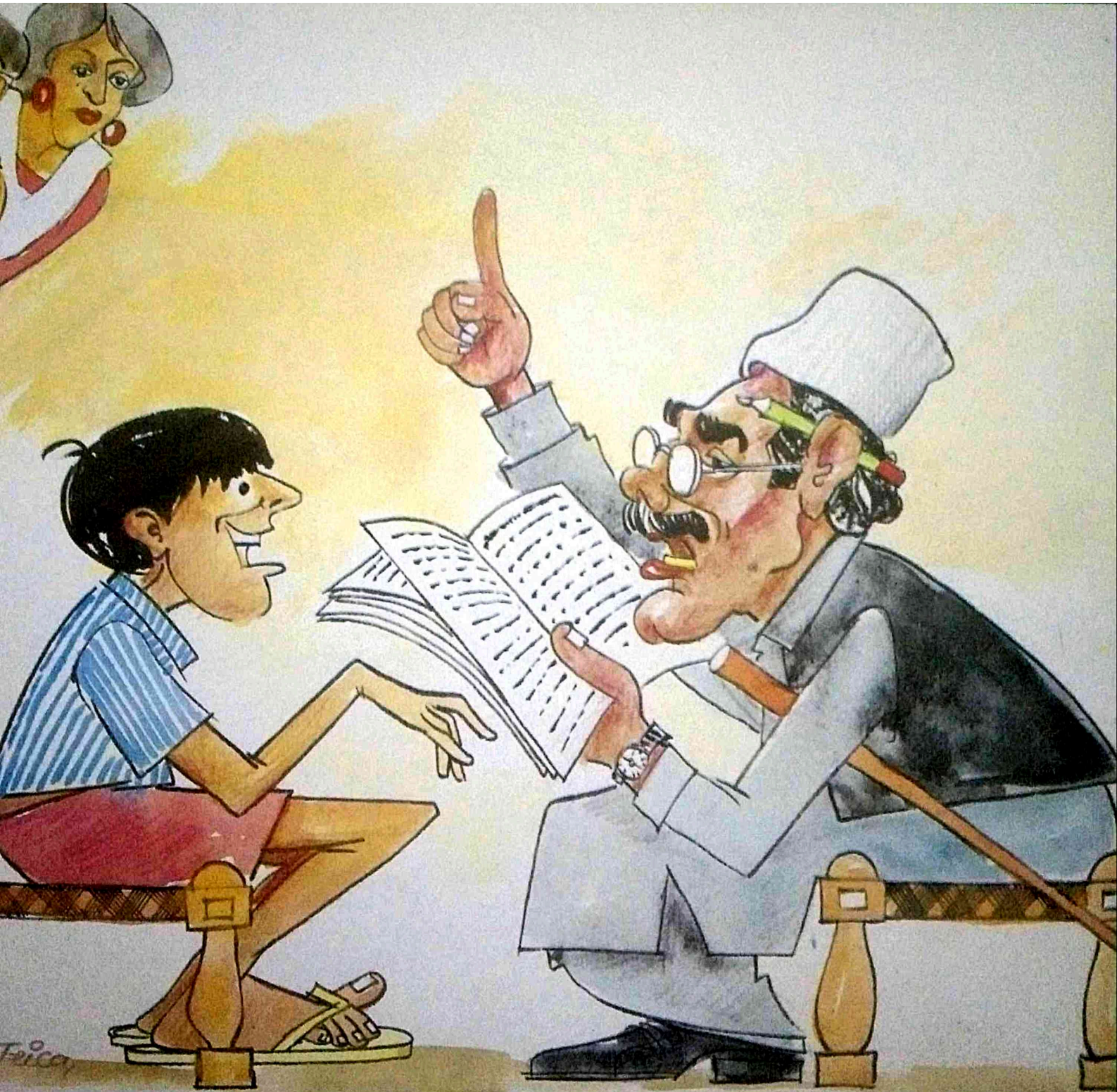
چونکہ کل کا سبق ہم کو یاد تھا لہذا ہم کو نیا سبق دیا گیا اور پھر انگریزی کا سبق شروع ہوا۔ انگریزی کے بعد حساب اسی طرح سکھایا گیا۔ گنتی ختم ہونے کے بعد ہی ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا ''اچھا اب جائیں۔'' ماسٹر صاحب نے کہا ''ابھی بیس ہی منٹ ہوئے ہیں اور پڑھو۔'' ہم کتابیں چھوڑ کر ماسٹر صاحب کے گردن میں لٹک گئے۔ ''آپ بڑے اچھے ہیں چھٹی دے دیجیے۔'' ماسٹر صاحب نے کہا ''اچھا جاؤ!'' اور خود بھی جانے کے لئے اٹھے ہی تھے کہ آواز آئی ''ماسٹر صاحب! ذرا ٹھہریئے گا۔''

والد صاحب اوپر کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ ماسٹر صاحب ان کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور والد صاحب نے کوٹھے کے اوپر سے اتر کر ماسٹر صاحب کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا ''آپ کل سے زحمت نہ کیجئے گا۔''

ہم کو ان ماسٹر صاحب کی جدائی کا تو چنداں افسوس نہیں ہوا مگر تین چار دن کے بعد ہی ایک دیو زاد ماسٹر صاحب ہم کو پڑھانے کے لئے مقرر کر دیئے گئے جن سے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں محض اس لئے خوش تھے کہ وہ ہم کو گھونٹا کرتے تھے سوا تین گھنٹہ تک اور وہ بھی خالی ہاتھ نہیں بلکہ قمچی کی مدد سے۔ بہر حال ان کی ان جفا کاریوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہم چائے کی پیالی کے کنڈے کو ''پ'' اور سروتے کو ''آر'' کہنے لگے۔